ناول "نیلی بار": سیاسی و سماجی تناظر میں
The Novel "Neeli Bar": In Political and Social Context

محمد شبیر[i] ڈاکٹر محمد رمضان طاہر[ii]

Abstract:

Tahira Iqbal is included among the prominent writers of the contemporary era. She is famous as a well-established novelist. Although, till date, her novel "Neeli Bar" has been published, and this novel brought her to the highest level of reputation, "Neeli Bar" is a sizeable novel that discusses and indicates different political, socio-economic, religious, and cultural problems of society. It seems that the writer focused on a specific area of Neeli Bar's civilization, culture, politics, and society, but in fact, the novel displays Pakistani civilization and culture. The whole story of this novel revolves around the lives of its characters, delving into their experiences, relationships, and emotional journeys. As we know, Punjab is the land of five rivers as well as five "bars.". Before the advent of the canal system, a mostly uninhabited area of Punjab was called "Bar," which literally means forest. Dr. Tahira Iqbal's novel "Neeli Bar" published in 2020. By reading this article, we will learn how the inhabitants of this region used to survive before the colonial system, especially from a from a socio-cultural perspective.

Keywords: *Urdu Novel, Neeli Bar, Tahira Iqbal, Pakistani Civilization, Culture, Punjab, Wedding Traditions, Regionally Rituals, Superstitions, Landlords, Oppressed.*

طاہرہ اقبال کا شمار عصر حاضر کی ممتاز ادیبوں میں ہوتا ہے۔ وہ ایک استاد ہیں اور فکشن نگار کے طور پر مشہور ہیں۔ ان کے ناول "نیلی بار" نے انھیں شہرت کی بلند سطح پر پہنچا دیا ہے۔ پنجاب پانچ دریاؤں کی سرزمین ہے ، نہری نظام کی آمد سے پہلے ، پنجاب کا زیادہ تر غیر آباد علاقہ تھا جسے بار کہتے تھے جس کا لفظی مطلب 'جنگل' ہے ، 'نیلی بار' دریائے ستلج اور راوی کے درمیانی علاقے کو کہا جاتا ہے۔ اسی علاقے کے نام پر لکھا گیا یہ ناول مختلف سیاسی ، سماجی ، اقتصادی ، مذہبی اور ثقافتی موضوعات پر بحث کرتا ہے۔ معاشرے کے مسائل پر انھوں نے 'نیلی بار' کے علاقے کا نام استعمال کیا ہے لیکن یہ ناول پوری پاکستانی تہذیب ، ثقافت ، سیاست اور معاشرے کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ ناول ۲۰۲۰ء میں شائع ہوا۔ اس مقالہ میں بتایا گیا ہے کہ اس خطے کے باشندے نوآبادیاتی نظام سے پہلے سماجی و ثقافتی سطح پر کس طرح زندگی کے دائرے میں رہتے تھے۔

کلیدی الفاظ: اردو ناول ، نیلی بار ، طاہرہ اقبال ، پاکستانی تہذیب ، ثقافت ، پنجاب ، شادی کی تقریب ، شادی کی روایات ، علاقائی رسومات ، توہمات ، جاگیردار ، مظلوم۔

ناول نگار زندگی کو اساس بنا کر جو کہانی لکھتا ہے دراصل وہ حقیقت سے آگاہی کا نام ہے۔ کوئی بھی باشعور انسان اپنی تہذیب اور سماج سے الگ رہ کر زندگی نہیں گزار سکتا۔ ناول ہی وہ ذریعہ ہے جو انسانی زندگی کے ہمہ اقسام واقعات و حقائق کو موضوع بنا کر کہانی کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ ناول کے اسی تسلسل اور روایات میں ڈاکٹر طاہرہ اقبال کا لکھا جانے والا ناول نیلی بار ایک ایسا 'جہاں نما' ہے جو لکھا تو اکیسویں صدی میں گیا ہے تاہم اس کی کہانی ہمیں ماضی کی دنیا سے روشناس کراتی ہے۔ ناول نیلی بار ۲۰۲۰ء میں دوست

i اسکالر پی ایچ۔ ڈی ، شعبہ اُردو ، اسلامیہ یونی ورسٹی ، بہاول پور۔ (Corresponding Author)
ii اسسٹنٹ پروفیسر ، شعبہ اردو ، اسلامیہ یونی ورسٹی ، بہاول پور۔

پبلی کیشنز اسلام آباد سے شائع ہوا۔ اس ناول کی بنیاد حقیقی واقعات پر رکھی گئی ہے جس کو ہمہ اقسام واقعات کا بیانیہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ ناول ذیلی دس ابواب پر مشتمل ہے جب کہ پورے ناول میں جو کہانی بیان کی گئی ہے وہ تین حصوں پر مشتمل ہے: نیلی بار کا تعارف، ملکی سیاسی منظر نامہ اور مذہبی منظر نامہ۔

طاہرہ اقبال کا ناول نیلی بار فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کے دور سے ذوالفقار علی بھٹو کے اقتدار اور پھانسی سے لے کر موجودہ دور تک کا بیان ہے جس میں اُس وقت کی مطلق روایات، سیاسی گہما گہمی، تہذیب و تمدن کی سرگوشیاں اور بوٹوں کی آہٹ جیسے مسائل و واقعات ملتے ہیں۔ عنوان سے لگتا ہے کہ ایک خاص علاقے کی تہذیب و ثقافت، سیاست اور سماج کو موضوع بنایا گیا ہے تاہم حقیقت یہ ہے کہ یہ ناول پورے پاکستان کی سیاست و سماج کی نمائندگی کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے، یوں اس ناول کا مرکزی کردار ''پاکستان'' ہے جسے ''نیلی بار'' کے دریچے سے دیکھا یا دکھایا گیا ہے۔ یہ مہاجروں، مقامی لوگوں، جاگیرداروں، صنعت کاروں اور اہلِ اقتدار جیسے کرداروں سے مل کر مکمل ہوا ہے۔ ناول کا بیانیہ ماضی اور حال کے متوازی سفر کر رہا ہے۔

'بار' کا لفظی مطلب جنگل ہے۔ نہری نظام کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد مختلف شہروں کے ساتھ ساتھ کئی مواضع اور چکوک آباد ہوئے ان چکوک کے نام بھی مختلف دریاؤں اور نہروں سے نکلنے والی نہروں کے مطابق دیے گئے۔ پنجاب کو پانچ باروں میں تقسیم کیا گیا ہے جس میں گنجی بار، ساندل بار، گوندل بار، کرانا بار اور نیلی بار شامل ہیں۔ 'نیلی بار' پنجاب کا وہ علاقہ ہے جو دریائے راوی اور دریائے ستلج کے درمیان واقع ہے۔ 'نیلی بار' کا نام دریائے ستلج کے نیلگوں پانی کی وجہ سے رکھا گیا جو کبھی اس دریا میں روانی سے بہتا تھا۔ اس خطے میں تین مکمل اضلاع: اوکاڑہ، پاک پتن اور ساہی وال، جب کہ ضلع قصور، وہاڑی اور خانے وال کے جزوی علاقے شامل ہیں۔ دریائے راوی اور دریائے ستلج کے کناروں پر مقامی لوگوں کی بستیاں بھی آباد تھیں، تاہم مشرقی پنجاب سے آنے والے مہاجرین کی ایک کثیر تعداد اس علاقے میں آباد ہوئی، جس کی وجہ سے اس خطے کی اکثریتی زبان پنجابی اساس ہے، جو مختلف لب و لہجے میں بولی جاتی ہے۔ یوں یہ علاقہ مشترکہ پنجابی ثقافت اور ادبی ورثے کا امین ہے۔ اس خطے کی ثقافت، زبان، رسوم و رواج، مذہب، سیاست، لوک داستانیں، یہاں تک کہ لڑائیاں اس کی پہچان ہیں۔

ناول نیلی بار وسطی پنجاب کے باشندوں کے رہن سہن کا بیانیہ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ آزادی

کے بعد ایک بار پھر یہ علاقہ جاگیر داروں، وڈیروں اور سرمایہ داروں کے شکنجے میں چلا گیا، اور کس طرح تاحال بیورو کریسی و انتظامیہ کے رحم و کرم پر ہے۔ عوام النّاس آج بھی بنیادی حقوق کو ترس رہے ہیں۔ معیشت اشرافیہ کے ہاتھوں میں ہے جس نے ظالم اور مظلوم کے دو طبقوں کو جنم دیا ہوا ہے۔ عوام قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ہاتھوں غلام بن کر رہ گئے ہیں۔ جاگیر دار اور وڈیرا شاہی مزدور خواتین کو لونڈی کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اسی حاکمانہ نظام کے متوازی سرمایہ دارانہ نظام بھی یہاں اپنی جگہ بنائے ہوئے ایستادہ ہے۔ اس ناول نیلی بار میں مصنفہ نے اسی نظام کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ سیاسی و سماجی شعور کی بیداری اور اس معاشی عدم مساوات سے وجود پانے والے نئے خیالات، نئے رجحانات اور نئے سیاسی و سماجی منظر ناموں سے قارئین کو آگاہ کیا ہے۔ ملکی تاریخ کی ورق گردانی سے پتا چلتا ہے کہ قیام پاکستان کے بعد تخلیق پانے والے اردو ادب میں سیاسی، سماجی اور اقتصادی زندگی اور اس سے وابستہ دیگر عوامل کی عکاسی کی نوعیت مختلف ادوار میں مختلف دکھائی دیتی ہے، جس میں سب سے اہم کردار زمانی تغیرات کی بدولت وقوع پذیر ہونے والی سیاسی اور تہذیبی تبدیلیوں کا ہے۔ ان تبدیلیوں نے معاشرے میں جس برق رفتاری سے فروغ پایا ہے اس کا لازمی نتیجہ طبقاتی اور اقتصادی تضادات کی صورت میں نمایاں ہوا جس نے پہلے سے موجود مسائل و معیارات پر کاری ضرب لگائی اور طے شدہ رویوں کو متاثر کرتے ہوئے مذہبی و اعتقادی، سیاسی و سماجی اور اخلاقی واقدار الغرض ہر سطح پر جدت پسندی کو رواج ملا۔ ان تمام مسائل کی نشان دہی پاکستانی ادب کی ہر صنف میں کی گئی تاہم ناول نیلی بار میں اس بیانیے کو مصنفہ نے قدرِ تفصیل سے بیان کیا ہے جس میں نہ صرف بھوک، غربت، مفلسی اور دیگر متعلقہ مسائل کو ابھارتے ہوئے کمزور طبقات کے استحصال کی عمدہ تصویر کشی کی گئی بلکہ قارئین کے سیاسی اور سماجی شعور کی بیداری کا سامان بھی کیا گیا۔ ناول نیلی بار میں مقامی لوگوں کی شادی بیاہ کی رسومات اور ثقافتی رنگوں کی پیش کش کا ذکر بڑی تفصیل سے ملتا ہے اور ناول کی کہانی کا آغاز ہی اس 'بار' میں ہونے والی ایک شادی کی روایتی رسومات سے ہوتا ہے جس میں مقامی آبادی کے رسم و رواج و روایات کو بڑی باریک بینی سے بیان کیا گیا ہے، بطور خاص جب بارات دلہن کے گھر پہنچ جاتی ہے تو ہجوم میں شامل مرد و خواتین کی ظاہری کیفیت کی ایک جھلک ملاحظہ کیجیے:

لال، ہرے، نیلے، پیلے بوچھنوں اور پراندوں میں لپٹی پہندی اور کڑوے تیل کی خوشبو

میں رچی رنگ برنگ گٹھڑیاں کچی دھول میں اوندھا گئیں۔۔۔ گہرے گہرے رنگ لپیٹے لڑکی والیاں سٹھنیوں کے زہر میں بجھے گیتوں کے تیروں سے لیس برات کے استقبال کو بڑھیں۔ باراتنیں اس ناگہانی حملے کے لیے تیار تھیں۔ جوابی سٹھنیوں سے مسلح دفاعی حصار بنا گئیں۔ دونوں دَلوں میں گھمسان کا رن پڑا۔[۱]

جب رخصتی کے بعد بارات واپس جا رہی ہوتی ہے تو اچانک آندھی اور طوفان کے جھکڑ کی زد میں آ کر بھٹک کر جھوک لنگڑیالوں کی حدود میں پہنچ جاتی ہے، جہاں لنگڑیالوں کے ڈاکو اور رسہ گیر دلہن اور اس کی تین سہیلیوں کو وفاقی وزیر ملک فتح شیر کی حویلی میں پہنچا دیتے ہیں۔ یہاں سے دلہن کی تین سہیلیاں کچھ دنوں کے بعد تاوان کی رقم کے عوض رہا ہو جاتی ہیں مگر دلہن ست بھرائی کا حُسن اور چال ڈھال دیکھ کر ملک فتح شیر کا اٹھارہ سالہ بیٹا عبدالرحمٰن درمیان میں آ جاتا ہے اور وہ دلہن کو اپنے ڈیرے پر لے جاتا ہے۔ ناول میں دلہن ست بھرائی اور اس کی سہیلیوں کے ساتھ ساتھ اس حویلی میں موجود نوکرانیوں پر ہونے والی جسمانی و جنسی زیادتیوں اور غیر انسانی رویوں کو ڈاکٹر طاہرہ اقبال نے انتہائی جرات اور بے باکی سے بیان کیا ہے۔ ایسے واقعات اور حقائق کی نشاندہی کی وجہ سے انھیں "پنجاب کی قرۃ العین بھی کہا جاتا ہے"۔[۲] ناول میں بتایا گیا ہے کہ ایک طرف حکمران طبقہ ہے جو علماء، پیروں، جاگیرداروں، زمینداروں، صنعت کاروں اور وزیروں پر مشتمل ہے اور دوسری طرف بے یار و مددگار غلام نما لوگ ہیں جو ان سب کی خدمت گزاری کے ذریعے زندگی کے اس کارواں اور معاشرے کے اس نظام کو بیلوں کی طرح ہنکے چلے جا رہے ہیں۔

پاکستان کی اکثریتی آبادی زراعت پیشہ ہے اور کاشتکاروں کی اکثریت بے زمین ہے جس کی وجہ سے انھیں بطور مزارعین جاگیرداروں اور وڈیروں کی ملکیتی زمینوں پر کام کرنا پڑتا ہے، اس وجہ سے انھیں بہت سے مسائل کا سامنا رہتا ہے۔ ناول نگار نے اپنے ناول میں مزارعین کے مسائل کی عکاسی کرتے ہوئے دیہاتی کاشتکاروں پر وڈیروں کے ظلم و ستم کو بے نقاب کیا ہے۔ ملک فتح شیر کی گفتگو ملاحظہ کیجیے جو وہ اپنی رعایا کے حوالے سے ذیلدار سے مخاطب ہے:

آپ تو جانتے ہیں سائیں۔ اپنی گرفت مضبوط رکھنے کو بعض اوقات رعیت کے ساتھ سختی بھی کرنا پڑتی ہے ورنہ پھر جو آپ کے ساتھ ہوا، آپ جانتے ہیں۔ ان غریبوں کو اگر آج رج کے کھانے اور سر اٹھا کر چلنے کی آپ اجازت دے دیں گے تو ان کا کمینہ خون کل آپ کے ہی

خلاف جوش مارے گا۔ انھیں بھوکا اور لاغر رکھو، ان کا سر انہی کے کمزور کندھوں میں دھنسائے رکھو، ان کی طاقت سے زیادہ ان سے کام لو، ان کی انا کو ہر روز کچلتے رہو کہ کہیں یہ اپنی کوئی عزت وزت نہ بنا بیٹھیں، ان کی عورتوں کی عزت کو پامال کرتے رہو، تاکہ بے غیرت بن کر خوف زدہ رہیں، جس روز یہ خوف کی کوکھ سے نکل گئے اس روز میری آپ کی بادشاہت بھی جاتی رہے گی، کہ ہم تو مٹھی بھر ہیں یہ اکثریت میں ہیں۔ ہمارا ان سے عددی مقابلہ تو ہے نہیں، بس انھیں اپنی طاقت سے دبائے رکھنا ہی ہماری کامیابی ہے۔[۳]

طاہرہ اقبال نے ناول میں جاگیر دارانہ سماج کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ خود طاہرہ اقبال کا تعلق بھی جاگیر دار گھرانے سے ہے، اسی وجہ سے وہ اس نظام کی تمام قباحتوں اور پسِ پردہ کہانیوں سے بخوبی واقفیت رکھتی ہیں۔ وہ جاگیر داروں اور وڈیروں کی عیاشیوں، بد عنوانیوں اور ظلم و جبر کو بڑی جزئیات سے بیان کرتی چلی جاتی ہیں۔ انھوں نے بڑی جرات مندی سے اس خطے کی سسکتی ہوئی زندگی کو اس کی کمزوریوں، منافقتوں، خامیوں، مصلحتوں اور مجبوریوں سمیت پیش کیا ہے۔ ان کے اس ناول کی یہی خوبی ہے جو انھیں اپنے ہم عصر ناول نگاروں میں نمایاں کرتی ہے۔

اس ناول کے نسوانی کردار مردانہ کرداروں کے برعکس زندگی کو اچھے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ حویلیوں میں زندگی گزارتی ہوئی پیرنیاں اور جاگیر دارنیاں ہیں جو بے یار و مددگار اور قید میں ہیں، جب کہ ان کے برعکس کھیتوں اور فصلوں میں کام کرتی سانولی اور کالی رنگت والی کم ذات لڑکیاں اور عورتیں آزاد ہیں۔ ناول میں اس بات کا بھی انکشاف کیا گیا ہے کہ نیلی بار کے اس سماج میں مرد اور عورت کے میل ملاپ کے لیے چار دیواری کا کوئی تصور نہیں، بلکہ اپنی جنسی تسکین کے لیے جنگلی جھاڑیاں، خشک کھال اور اونچی فصلوں کو ہی قدرتی پردہ گاہیں تصور کیا جاتا ہے۔ عورتیں مردوں کو رجھانے کے لیے کھلے عام ٹھٹھے لگاتی ہیں اور شادی بیاہ کے موقع پر مرد لڑکیوں اور بن سنور کر آنے والی بڑی عمر کی عورتوں کے قریب سے گزرتے ہوئے چٹکی بھر دیتے ہیں۔ اسی طرح کے ایک واقعہ میں مہاجر عورتیں غصے اور نفرت سے کہتی ہیں:

ہائے نی! ناں کرنا تو سیکھیا ہی نہیں جنگلیوں، لچیوں نے، جو بھی کہے و نہیں مجلی (دھوتی) اٹھا دیتی ہیں۔ اڑیو! اسی لیے تو شلوار نہیں پہنتیں کہ نالہ کھولنے میں جھٹ دیر لگے گی، ہائے نی! اپنے مردوں کو بچاؤ یہ تو عزت تلی (ہتھیلی) پر رکھ پھرتی ہیں۔[۴]

یوں ڈاکٹر طاہرہ اقبال نے نیلی بار میں جو زندگی پیش کی ہے وہ حقیقت سے انتہائی قریب تر ہے اور اس کا سماج دیہاتی پس منظر رکھنے والا بڑا رنگا رنگ سماج ہے۔ 'نیلی بار' کے تپتے صحراؤں اور میدانوں میں زندگی کی ہماہمی اپنی تمام تر رنگینوں کے ساتھ جاری ہے۔ دیہاتی پس منظر میں مصنفہ دکھاتی ہیں کہ کیسے دیہاتوں میں خواتین مردوں کے ساتھ مل کر نہ صرف فصلیں بوتی اور کاٹتی ہیں بلکہ پُھٹی کا چُننا اور کھیتوں میں مردوں کو کھانا پہنچانے جیسے کام بڑی جاں فشانی اور ایمان داری سے کرتی ہیں۔ اس ناول میں مصنفہ کی ذاتی شخصیت کی جھلک، ان کا تجربہ، گہرا مشاہدہ اور باریک بینی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے اپنے ذاتی تجربے کی بناء پر وہی زبان استعمال کی ہے جو اس ماحول پر بالکل فٹ آتی ہے۔ دیہات کا بیان کرتی ہیں تو اس کی مناسبت سے الفاظ کا چناؤ کرتی ہیں، شہر کا ذکر کرتے ہوئے ویسے ہی مکالمے ادا کرتی ہیں جو اس مخصوص کردار کی ضرورت ہو۔ یہ ڈاکٹر طاہرہ اقبال کی زبان ہی ہے جو فطرت کی رعنائیوں اور بے باکیوں کو عیاں کرتی ہے۔ دیہات میں بات بات پر گالی دینا عام ہے۔ وہ نہایت بے تکلفی سے ان دیہاتی زبان زد عام گالیوں کو لکھتی چلی جاتی ہیں اور کسی قسم کے مصنوعی پردے نہیں ڈالتیں۔ انھوں نے اُن سماجی ممنوعات سے چھیڑ چھاڑ کی ہے جس کو ہمارا معاشرہ مشرقیت کے نام پر کہنے کی اجازت نہیں دیتا، بلکہ انھوں نے جو کچھ دیکھا، بلا جھجک لکھ ڈالا۔ ویسے بھی فحاشی سرمایہ داری نظام کی ہی ایجاد ہے۔ یہ نظام انسانوں سے ہر وہ قوت چھین لینا چاہتا ہے جو اس کے لیے خطرہ بن سکے۔ ڈاکٹر طاہرہ اقبال ملکانیوں اور ذیلدارنیوں کی زبان و کلام سے بخوبی واقف ہیں اور بتاتی ہیں کہ ان حویلیوں کی خواتین کس انداز سے ٹھیٹ پنجابی گالیوں کا بے دریغ استعمال کرتی ہیں۔ اس صورتِ حال پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر انوار احمد رقم طراز ہیں کہ "اس کی یاد میں ایسی ملکانی ہے جس کے پاس لفظوں، محاوروں اور فطری محسوسات کی بلاغت یعنی گالیوں کا بے پناہ ذخیرہ ہے۔"[۵] اس تناظر میں جنسی گالیوں سے بھرپور ایک اقتباس ملاحظہ کرتے ہیں:

> ادھر باہر نکل میں تیری جاہنگیں چیروں، تجھے سانڈ کے نیچے ڈالوں، کمینی باہر دفع ہو جا، اپنے بھنتے چولہے میں مڈیاں ڈلوا لے، خبردار جو آئندہ کسی نے بختو سے بات کی تو منہ سے ٹانگ گھسیٹروں کی اور چوتڑوں سے باہر نکالوں گی۔ تمہاری فلاں تھوک میں مرچیں کٹواؤں گی۔[۶]

ناول نیلی بار ایک کہانی ہی نہیں بلکہ 'نیلی بار' کے وسیب کی ایک دستاویز ہے جس میں اُس کی شناخت، سیاست، مذہب، دیہی و شہری زندگی میں فرق، امیروں کا غریبوں پر ظلم، عورتوں کے حقوق، پنجابی زبان اور پنجاب کے رنگوں کو سمویا گیا ہے۔ یہ ناول قاری کو کئی دہائیوں کی سیر کراتے ہوئے مختلف سیاسی منظر ناموں اور نظاموں کے ساتھ ساتھ 'نیلی بار' کے قدیم و جدید حقائق سے آگاہی دیتا ہے۔نیلی بار ناول میں ہماری ساٹھ سالہ تاریخ سانس لے رہی ہے۔ اس میں سیاست دانوں کی مختلف سازشوں اور حربہ سازیوں کے ساتھ ساتھ جاگیرداروں، جرنیلوں اور بیوروکریٹس کی آفیشل اور نجی زندگی کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ روٹی، کپڑا اور مکان کا دلفریب نعرہ لگانے والے لیڈر جب بر سر اقتدار آتے ہیں تو پلک جھپکتے ہی ان کے تیور بدل جاتے ہیں، وہ اپنے علاقے کی بجائے دارالحکومت کے پوش علاقے میں لمبی تان کے سو جاتے ہیں۔ کسان، مزدور اور محنت کش بے چارے زمینوں کا مالک بننے کے خواب دیکھتے دیکھتے بوڑھے ہو جاتے ہیں اور یونہی نسل در نسل صدیوں سے وہ اپنا خون پسینہ بہا رہے ہیں۔ ان ہاریوں نے کبھی کھل کر یا پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔ وہ خوش کن خیالوں میں مبتلا ہو کر ایک دوسرے کو کہتے ہیں :۔

> نبی پیغمبر خدا خود بھیجتا ہے۔ جب خلق خدا پر جاگیرداروں، امیروں کا یہ کالا ظلم حد سے بڑھ جاتا ہے تو پھر اس بستی میں ایسے ہی نبی اور پیغمبر اترتے ہیں۔ ان کا پیغام بیج کے چھٹے کی طرح ہر کھیت، ہر بیگھے میں برس کر انگور نکال لاتا ہے۔[۷]

اس ناول میں بطور خاص عورت کی محرومیوں اور عام آدمی پر ہونے والے ظلم و جبر کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر طاہرہ اقبال اپنے ہم عصروں کے مقابل ایک بے رحم حقیقت نگار کے طور پر سامنے آئی ہیں، انھوں نے جس بے باکی سے جنسی بے راہ روی اور اس کے متعلقات پر قلم اٹھایا ہے، ماسوائے قرۃ العین حیدر کے ابھی تک پڑھنے یا سننے میں نہیں آئی۔ ناول میں سیاست، سماج اور اس کے متوازی جو مذہبی منظر نامہ بھی بیان کیا جا رہا اس کے بارے میں مصنفہ نے انتہائی دلیری سے وہ باتیں بھی لکھیں ہیں جسے لکھتے ہوئے انتہائی جرات درکار ہے۔نیلی بار کی زبان و بیاں کے بارے میں مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں :

> اردو کے بیشتر ناول گونگے ہیں، وہ بولتے نہیں، ڈاکٹر طاہرہ کا ناول بولتا ہے۔ آوازوں کا غدر مچ جاتا ہے۔ زمینی مناظر زندہ ہو جاتے ہیں۔ ڈاچیاں بلبلاتی ہیں، کجاووں میں براجمان عورتوں کے بدن دوہائی دینے لگتے ہیں۔ کماد اور شٹالے کے کھیتوں میں سے پیراہن

سنبھالتی حسین دیویاں بہت سیاہ رنگت کی ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ دربار لگ جاتے ہیں اور انار چھوٹتے ہیں اور جب آندھی کا سرخ غبار اٹھتا ہے تو اس کی گونج سنائی دینے لگتی ہے۔[۸]

ناول میں بہت سے ایسے واقعات بیان کیے گئے ہیں جو پاکستان میں اہم تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت رہے ہیں جن میں بطور خاص مزاروں اور درگاہوں پر گدیوں کی تبدیلی، پیریاں مریدیاں، سماجی واقتصادی نظام میں حکومتیں بنانے اور گرانے والے مہرے، شادی بیاہ کی رسومات سب کو ادبی مگر کچھ اپنے ہی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ طاہرہ اقبال نے ایک طرف جہاں جاگیر داری کلچر کی جبری روایات اور من مانیوں کو پیش کیا تو دوسری طرف فکشن کے پیرائے میں یہ حقیقت بھی بیان کی ہے کہ استحصال اور جبر کا شکار یہ طبقہ اپنی حالت خود بھی نہیں بدلنا چاہتا۔ وہ نہ جانے کیوں اس ظلم وزیادتی پر خاموشی اختیار کیے ہوئے ہے۔ یہی وہ چبھتا ہوا سوال ہے جس کا جواب اس ناول کے توسط سے مانگا گیا ہے۔ اس استفسار میں مقامیوں کے علاوہ بھارت کے شہر جالندھر، امرت سر اور گرداس پور سے آنے والے مہاجرین اور پاکستان میں سیالکوٹ، چکوال اور پنڈی سے آنے والے جٹ، ملک، گکھڑ، آرائیں، ذیلدار اور چودھری شامل ہیں۔ مصنفہ نے اپنے اس ناول میں اس خطے کے کرتے دھرتے لوگوں کی اجارہ داریوں کے کرداروں کو بے نقاب کرتے ہوئے سب کو دلچسپ پیرائے میں سمیٹا ہے اور اس دھرتی پہ رخنہ ڈالنے کی واردات کو یوں دکھایا ہے:

سائیں اس قوم کا دل اس 'بار' کی مٹی سے بنا ہے جو اس کے پانیوں سے دھڑکتا ہے جس کی تاثیر سے یہ یکھتا ہے جب کہ باہر سے آنے والے لوگ اس کی ملکیت و وراثتوں والے ہو گئے یہ تو بس مٹی کے کیڑے ہیں۔[۹]

ڈاکٹر طاہرہ اقبال کہانی میں کرداروں کا چناؤ کرداروں کی نفسیاتی کے مطابق ہی کرتی ہیں۔ سیاستدانوں اور انقلابیوں کے اصلی چہرے عوام کے سامنے لاتی ہیں اور انھیں بتاتی ہیں کہ یہ لوگ عوام کو سبز باغ دکھا کر استحصال کرتے ہیں۔ اپنی جذباتی تقریروں سے ان کے لہو میں آگ بھڑکا دیتے ہیں لیکن اپنے مفاد کے لیے ایک ہو جاتے ہیں یہ دراصل یہ ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے ہوتے ہیں، اقتباس ملاحظہ کیجیے:

میں نے دیکھا کہ دونوں مخالف گروپوں والے ایک کمرے میں بیٹھے روسٹ پرندوں کے مزے اُڑا رہے تھے اور نیچے عوام سڑک پر گولیاں کھا رہی تھی اور نیچے جھانک جھانک کر قہقہے لگا رہے تھے۔[۱۰]

اس ناول میں اُن حقائق سے پردہ اٹھایا گیا ہے جو پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد سے اب تک تواتر سے جاری ہے۔ یہاں ووٹ کی بنیاد پر منتخب ہونے والا حکومت نہیں کرتا بلکہ اسٹیبلش منٹ کا وہ مہرہ حکومت کرتا ہے جو الیکشن نہیں جیتتا بلکہ اسے الیکشن جتوایا جاتا ہے۔ حکومت بنوانا یا گرانا آئینی یا قانونی نہیں، سب غیبی قوت سے ہی ممکن ہوتا ہے۔ ازلی دشمنی کو دوستی اور دوستی کو ازلی دشمنی میں بدلنا؛ دائیں یا کبھی بائیں ہاتھ کے استعمال سے کیا جاتا ہے۔ کس کو وزیر، مشیر اور سیکرٹریز لگوانا ہے اور پھر انھیں کب مکھی کی طرح اقتدار کے دودھ سے نکال باہر پھینکنا ہے، کوئی اچنبھے کی بات نہیں، یہ سارے فیصلے اوپر ہی اوپر طے کر لیے جاتے ہیں۔ جہاں کوئی عوامی نمائندہ ہونے کے زعم میں مبتلا ہو کر اپنی مرضی کرنے لگے تو اقتدار کا ہُما اس کے سر سے پُھر سے اُڑ جاتا ہے اور کسی دوسرے کے سر کی زینت بنا دیا جاتا ہے، لیکن پہلی بار یہ حادثہ ہوا کہ اقتدار کا دھارا زمینوں اور جاگیروں سے ملوں اور فیکٹریوں کی سمت مڑ گیا۔ اب تو شیر چنگھاڑ رہا تھا جس کی چنگھاڑ پورے ملک میں سنائی دیتی ہے کہ "دیکھو دیکھو کون آیا، شیر آیا شیر آیا۔"[11]

ہمارے ہاں اگر سیاسی تاریخ کی ورق گردانی کی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہاں اقتدار اپنی مرضی سے آتا ہے نہ اپنی مرضی سے جاتا ہے۔ ڈاکٹر طاہرہ اقبال نے اپنے اس ناول میں بڑی تفصیل سے مارشل لاء کے آنے اور جانے میں عوام کے جذبات کی عکاسی کی ہے۔ وہ عوام جو اَن پڑھ ہیں، ان میں سیاسی شعور اجاگر نہیں ہونے دیا گیا تاکہ ہر آنے والا انھیں اپنے مفادات کی بھینٹ چڑھاتا رہے۔ ان کی آراء، ان کے تبصرے کچھ اسی قسم کے ہوا کرتے ہیں کہ ڈنڈا مجبور ہو کر آتا ہے جو اس وقت کی اہم ضرورت ہوتی ہے ورنہ سویلین حکمران تو ملک کو نیست و نابود کر دیں۔ وطنِ عزیز جس نہج پر رواں دواں ہے اب اس کی سلامتی اور بقا میں سویلین کے ساتھ ساتھ بندوق اور بوٹ لازم و ملزوم ہیں:۔

> اب یہ اعلیٰ و ارفع آسمانی مخلوق، رومانوی دیوتا جیسے ایک بار پھر زمینوں پر اتر آئے تھے
> کیوں کہ اس مفسد اور گمراہ قوم کو سدھارنے کے لیے ان کی ضرورت آن پڑی تھی۔۔۔
> اکڑے ہوئے ملبوسات میں تنی ہوئی گردنیں سروں کے اوپر ہی اوپر چہار اطراف نگرانی
> کرتی تھیں۔۔۔۔۔ کوئی مفسد تو نہیں چھپا بیٹھا، اختلاف رائے کا مجرم۔[12]

فوجی نصیر جو کہ فوج میں اپنی ملازمت مدت کے بعد ریٹائر ہے، اس ناول کا ایک اہم کردار ہے۔ وہ

گاؤں میں خبتی کے نام سے مشہور ہے تاہم اپنے آپ کو عقلِ کُل سمجھتا ہے، تھوڑا بہت پڑھا لکھا بھی ہے، جس بناء پر گاؤں کے سیدھے سادھے لوگ اس کو اپنا مسیحا مانتے ہیں۔ گاؤں کے لوگوں کو امریکا میں ہونے والے نائن الیون اور دیگر سانحات پر لیکچر دیتا رہتا ہے۔ اس کا گھر درسگاہ کی حیثیت اختیار کیے ہوئے ہے جہاں وہ سادہ دیہاتی لوگوں کو جمع کر کے امریکا کے خلاف یوں پُر جوش نعرے اور قہقہے لگواتا ہے:۔

> بھائیو! گھر جلا کر چراغاں نہیں کیا کرتے۔ وہ بڑا چالاک اور بے اصول دشمن ہے یہ بھی اس کی اپنی چلی ہوئی کوئی چال لگتی ہے۔ غریب مسلمانوں کو پھانسنے کی گہری سازش، ورنہ جہاں چڑیا پر نہیں مار سکتی وہاں ایسا واقعہ۔[۱۳]

یہ سادہ لوح دیہاتی بین الاقوامی سیاست کی الف ب سے بھی واقف نہیں۔ انھیں کیا معلوم کہ اب پھر مجاہدین کی نئی صف بندی ہو گی جو اس بدمست سفید ہاتھی کی لگائی ہوئی آگ کا ایندھن بنیں گی۔ یوں طاہرہ اقبال نے ہر دور کے نام نہاد انقلابیوں کو بے نقاب کیا ہے۔ وہ بتانا چاہتی ہیں کہ ان نئے دیدہ زیب لباسوں میں موجود شکلیں تو نئی ہو سکتی ہیں لیکن سوچ وہی پرانی ہے۔ یہ اپنے اقتدار کے لیے لوگوں کو استعمال کرتے ہیں۔ الیکشن کے دنوں میں ڈیرے پر طرح طرح کے پکوان تیار کیے جاتے ہیں گویا کہ ہر طرف ایک جشن کا سا سماں ہوتا ہے لیکن ضرورت پوری ہونے پر انھیں بھاری بوجھ کی طرح اتار پھینکنے میں دیر نہیں لگاتے۔

نیلی بار میں سیاسی و سماجی کردار کہانی میں کہیں متوازی اور کہیں باہم شیر و شکر کیے نظر آتے ہیں۔ ناول کی کہانی میں صفورہ اور بختاور کا کردار جاگیر دار نظام کے منہ پر ایک طمانچہ ہے، ایسے لوگوں کی معاشرے میں برائے نام عزت ہوتی ہے۔ یہ جاگیر دار اور وڈیرے لوگ اپنی پگڑی کی جھوٹی آن بان کی خاطر بہنوں اور بیٹیوں کی شادی نہیں کرتے اور بلا وجہ ان پر غیر فطری پابندیاں لگا دی جاتی ہیں جو بالآخر صفورہ جیسی خاتون کی صورت میں ایک طاقتور نسوانی کردار کے طور پر سامنے آتا ہے، جو اس ناروا سلوک اور نظام کے ساتھ بغاوت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ تمام تر پابندیوں اور شدید ترین ردِ عمل کی توقع کے باوجود وہ فطری تقاضوں کو پورا کرتی نظر آتی ہے، خواہ وہ طریقہ جائز ہو ناجائز۔ حقیقت میں یہ اُس جاری نظام کے خلاف بغاوت کی ایک شعوری کوشش جو صدیوں سے جاری ہے۔ بقول صفورہ:

> اس حویلی کی فضاؤں نے تو کبھی کسی گڑیا کو رخصت ہی نہیں کیا۔ یہاں گڈے بیا ہے

> جاتے تھے اور روز بیاہے جاتے تھے۔ گڑیا تو اپنے ہی اکلاپے سے بیاہ دی جاتی تھیں۔ اپنے ہی وجود کے محبس میں اپنے ہی تصورات کی سرکشی سے نکالی جاتی تھیں۔ جہاں ان کے دولہوں کی براتیں کبھی نہیں اترتی تھیں۔ اپنے ہی سان گمان کی بارات کو اپنا دہی لہو اور بوٹیاں کھلاتی اپنے ہی اندر چھڑی دیگوں میں خود ہی گھلتی پکتی بھسم ہوتی رہتی تھیں۔"[14]

ڈاکٹر طاہرہ اقبال ناول میں سماج کے نام نہاد ٹھیکے داروں کے گھناؤنے چہروں سے نقاب اتارتی ہیں کہ کس طرح سماجی رہن سہن اور ظاہری رکھ رکھاؤ کی بھینٹ چڑھنے والی صفورہ ہے جو کہ ملک فتح شیر کی بہن ہے، جس کا بھائی فتح شیر اس سے ڈر سے شادی نہیں کرتا کہ کہیں جاگیر تقسیم نہ ہو جائے اور خاندانی شملہ جھک جائے۔ حویلی میں آئے دن سرِ عام جنسی میل ملاپ کا کھیل دیکھ دیکھ کر صفورہ کے جذبات انگڑائی لیتے ہیں اور وہ جذبات کی رو میں بہہ کر ایک دن حویلی کی خاص نوکرانی کے ساتھ حویلی کے خفیہ راستے سے باہر نکل جاتی ہے اور سیدھی ملک فتح شیر کے نجی قید خانے میں قید ملک کے خاص وحشی ڈکیت سے مل کر تسکین پاتی ہے اور پھر یہ سلسلہ کئی ماہ جاری رہتا ہے۔ ایک دن رقیہ جو اپنی نند پر نظر رکھے ہوتی ہے، جب دیکھتی ہے کہ صفورہ کو ماہواری نہیں آ رہی تو وہ ملک فتح شیر کو اس کی اطلاع دیتی ہے۔ دائی سے تصدیق کے بعد حویلی میں سناٹا چھا جاتا ہے کہ اب وہ ان حالات کو کیسے نارمل کیا جائے۔ ملک فتح شیر اس کو ایک کرامت کا روپ دیتا ہے کہ دیکھو اس کی کنواری بہن کو کسی نے چھوا تک نہیں اور اس کے باوجود وہ حمل سے ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ صفورہ امام مہدی کو جنم دینے والی ہے یوں وہ اپنی 'عزت' بھی بچاتا ہے اور صفورہ کے لیے اعلان ہوتا ہے کہ وہ پاکیزہ ہستی ہے، یہ دھرتی اس کے قابل نہیں، مہدی کی پرورش کے لیے ضروری ہے کہ وہ لاہور میں داتا دربار کے سائے میں پلے۔ یوں اس کو رخصت کیا جاتا ہے اور راستے میں اسی ڈکیت، جس کی نشانی صفورہ کے اندر پل رہی ہوتی ہے، کے ہاتھوں اس کا کام تمام کر دیا جاتا ہے۔

ناول کے مرکزی کردار علی جواد اور زارا فتح شیر ہیں۔ دونوں ہم جماعت ہیں۔ علی جواد نے غربت اور تنگ دستی میں آنکھ کھولی جب کہ زارا، اسی صفورہ کے بھائی فتح شیر کی بیٹی ہے۔ علی اور زارا دونوں شادی کے بندھن میں بندھ جاتے ہیں لیکن جلد ہی طلاق ہو جاتی ہے۔ علی جواد جو پہلے اشتراکی تھا، اب مذہبی لبادہ پہن کر علی محمد معاویہ بن جاتا ہے۔ مدرسوں میں تربیت دینے کا کام سرانجام دیتا ہے۔ زارا فتح شیر جو کہ سرمایہ دار کی بیٹی ہے اس کو گھر میں مختلف پابندیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور محض بیٹے کی خاطر ایک مولوی کی

چوتھی بیوی بن جاتی ہے مگر الیکشن میں بی اے کی شرط لازمی ہوتی ہے تو مولوی صاحب اپنی روشن خیال بیوی کو انتخاب لڑنے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ وہ جیت کر وزیر مذہبی امور بن جاتی ہے۔ علی جواد کو جن لوگوں نے مولوی محمد علی معاویہ بنایا تھا وہی اسے قتل کر دیتے ہیں۔

ناول کے زنانہ کرداروں میں زارا اور پاکیزہ نامی دو خواتین ہیں جو کہ ایک ہی طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود دو الگ الگ زندگیاں گزارتی ہیں جب کہ مردانہ کرداروں میں علی جواد ملک معصوم اور پڑھے لکھے طبقے کا نمائندہ ہے، جو قیامِ پاکستان سے لے کر آج تک سیاسی نظام کا آلہ کار رہا ہے، لیکن معصوم رعایا ان کے مکروہ عزائم اور مکروہ چہروں سے ناواقف ہیں۔ ان کا کردار استحصال کرنے والے طبقوں کی ضرورت کے تحت بدلتا رہتا ہے۔ علی جواد کے کردار کا محمد علی معاویہ تک کے سفر کو دیکھیں تو بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ کن کے اشاروں سے ایسا ہوتا ہے۔ عبد الرّحمٰن کا کردار بیک وقت جاگیر دار اور سیاستدان کا نمائندہ ہے، جو ایک عیاش اور جنسی مریض ہے جس کے لیے غریب اور لاچار کی عزت کو پامال کرنا گویا ایک کھیل سے زیادہ کچھ نہیں۔ انہی کرداروں میں نام نہاد پیر اسرار احمد کا کردار بھی ہے جس کے مکروہ دھندوں کے ذریعے اس معاشرے میں حد سے بڑھی ہوئی توہم پرستی اور پیر پرستی کی عکاسی کی گئی ہے۔ عوام دنیا و آخرت کی ہر چیز کو پانے کا واحد ذریعہ پیر ہی کو جانتے ہیں۔ توہم پرست اپنی جوان بہنوں اور بیٹیوں کو پیروں کی درگاہوں کی خدمت میں بطور نذرانہ بھیج دیتے ہیں، اور پیروں کو انسانی عیوب سے پاک سمجھتے ہیں:۔

> زیارت کا وقت شروع ہو چکا تھا۔ مریدین کی لمبی لمبی قطاریں بندھی تھیں۔ سروں پر رومال باندھے سینوں پر دونوں ہاتھ جوڑے نگاہیں جھکی قدم قدم حد ادب میں بڑھتے ہوئے کہیں سوئے ادب نہ ہو جائے۔ خبردار! یہ بارگاہ ادب واحترام ہے۔ بے ادبی کا شائبہ بھی عمروں اور آنے والی نسلوں کو برباد کر دے گا۔ مزار کی گوٹا کناری جڑی چادروں کی طرح اپنی کنواری نو عمر لڑکیاں بھی پیر خانوں کو نذر کر جاتے تھے۔ یہ لاڈلیاں اچھی طرح جانتی تھیں کہ پیر خانے کا ذلیل ترین کام بھی قیامت کے روز نامہ اعمال میں سب سے اتم لکھا جائے گا بل کہ جتنا ذلیل ہو گا جنت کا حصول اتنا ہی سہل ہوتا چلا جائے گا اور وہ اپنے گناہگار والدین کے لیے جنت کے دروازے پر دربان بن کر کھڑی ہو جائیں گی۔[۱۵]

محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر طاہرہ اقبال ہر قسم کے استحصالی طبقے کے خلاف علم جہاد بلند کیے ہوئے

ہیں۔ وہ اپنے ناول میں جاگیر دار، سیاست دان، پیر، ملاؤں اور مذہب کے نام پر لوگوں سے کھلواڑ کرنے والوں کے خلاف سینہ سپر ہیں اور ان کے چہروں پر پہنے نقابوں کو تار تار کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ناول نگاری اپنے ارد گرد کے سماج میں ہونے والے روز مرہ کے حالات و واقعات کی روداد ہی ہوتی ہے جن کو مصنف کہانی کی صورت میں ترتیب زمانہ کے لحاظ سے بیان کرتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر مصنف کہانی ہی کی بدولت تہذیب اور معاشرت کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے ناول کو اس کے پلاٹ کے سانچے میں ڈھالتا جاتا ہے۔ یہ تخلیقی عمل در حقیقت شعور کی اس کیفیت کا نام ہے جو معاشرے ہی کے رد عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔اردو ناول کی روایت ، تنقید و تجزیہ اور تلخیص میں نثار دانش ناول نیلی بار پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ”جاگیر دار طبقہ عوام کو جانوروں سے بھی حقیر مخلوق سمجھتا ہے۔ جاگیر دار کے کتے اور گھوڑے کی اہمیت ایک غریب انسان سے زیادہ ہے۔ غریب کی عزت و اہمیت نہ ہونے کے برابر ہے حتی کہ جاگیر دار کسی غریب کی بیٹی کو دن دیہاڑے اٹھا کر لے جاتا ہے اور اپنی ہوس کا نشانہ بناتا ہے لیکن کوئی پوچھنے والا ہے نہ ہی کوئی قانون حرکت میں آتا ہے۔ دیہی معاشرے میں جاگیر داروں کے یہی ہتھکنڈے ہوتے ہیں جب کہ شہروں میں حسب ضرورت مختلف طریقوں سے عوام کا استحصال کیا جاتا۔ اپنے سیاسی عزائم کی تکمیل کے لیے سیاست دانوں اور جاگیر داروں نے یونی ورسٹی کو بھی اپنے مکروہ عزائم کی بھینٹ چڑھا دیا اور ملکی جامعات میں اپنے مفادات کے لیے نوجوان اور جوشیلے طلبہ میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا کی اور انھیں نظام کے خلاف کھڑا کر دیا۔ ایسے معصوم طلبہ کا نمائندہ کردار علی جواد کی صورت میں سامنے آتا ہے جو مقتدر طبقوں کے ہاتھوں میں ایک کٹھ پتلی کی طرح ہے۔“[۱۶]

ڈاکٹر طاہرہ اقبال نے نیلی بار میں جن موضوعات پر لکھا ہے وہ اردو ادب میں نئے تو نہیں ہیں، لیکن ان کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے اندازِ بیاں سے جدت و ندرت پیدا کر دی ہے۔ ان کے قلم کی کاٹ، ان کے منفرد سٹائل کی بے باکی اور ان کی فکر ہی ہے کہ جس نے انھیں بہ قول مستنصر حسین تارڑ ”بلونت اور بیدی پر بھی فوقیت دلائی ہے۔“[۱۷] ڈاکٹر طاہرہ اقبال نے اپنے اس ناول میں ملکی سیاست میں ہونے والے جوڑ توڑ اور اسٹیبلش منٹ کے کردار کے علاوہ بین الاقوامی سیاسی صورت کو بھی بڑی باریک بینی سے بیان کیا ہے جن میں بطور خاص نائن الیون، ورلڈ ٹریڈ سنٹر کا واقعہ، افغانستان پر بڑی طاقتوں کا قبضہ جیسے

بڑے بڑے واقعات شامل ہیں، الغرض انھوں نے ہمارے عہد کی گھٹن، معاشی ناانصافیوں، طبقاتی کشمکش، سیاسی خرابیوں، جاگیر دارانہ نظام کی من مانیوں، مذہبی اداروں (مدرسوں، مزاروں، درگاہوں) کا احوال، سادہ لوح دیہاتیوں کا جذبہ شہادت؛ الغرض محلات سے لے کر جھونپڑیوں تک کی تمام روداد مکمل حقائق و جزئیات کے ساتھ پیش کی ہے۔ طاہرہ اقبال نے اپنے تخلیقی تجربے اور اس علاقے میں رہتے ہوئے ایک عام دیہاتی کے مشاہدے کی حیثیت سے جو دیکھا، جو سنا یا جو محسوس کیا سب کچھ نتائج سے بے خبر ہو کر اس خطے کے متنوع رنگوں کو ایک کہانی کی شکل میں کہہ دیا ہے جو آنے والی نسلوں کے لیے ایک دستاویز ہو گی۔

حوالہ جات

۱۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۲۰ء)، ۱۱۔
۲۔ مستنصر حسین تارڑ، ''پیش لفظ''، مشمولہ: نیلی بار، طاہرہ اقبال (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۲۰ء)، ۷۔
۳۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ۸۰۔
۴۔ ایضاً، ۹۸۔
۵۔ ڈاکٹر انوار احمد، ''ملکانیوں سے منحرف طاہرہ اقبال''، مشمولہ: زمیں رنگ، طاہرہ اقبال (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء)، ۷۔
۶۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ۱۱۰۔
۷۔ ایضاً، ۱۱۴۔
۸۔ مستنصر حسین تارڑ، ''پیش لفظ''، مشمولہ: نیلی بار، طاہرہ اقبال (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۲۰ء)، ۷۔
۹۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ۱۲۸۔
۱۰۔ ایضاً، ۱۹۰۔
۱۱۔ ایضاً، ۳۴۴۔
۱۲۔ ایضاً، ۳۷۸۔
۱۳۔ ایضاً، ۳۹۷۔
۱۴۔ ایضاً، ۳۹۲۔
۱۵۔ ایضاً، ۴۰۲۔
۱۶۔ نثار دانش، اردو ناول کی روایت، تنقید و تجزیہ اور تلخیص (لاہور: ورڈویو پبلی شرز، ۲۰۱۷ء)، ۲۶۱۔
۱۷۔ مستنصر حسین تارڑ، ''پیش لفظ''، مشمولہ: نیلی بار، طاہرہ اقبال (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۲۰ء)، ۷۔